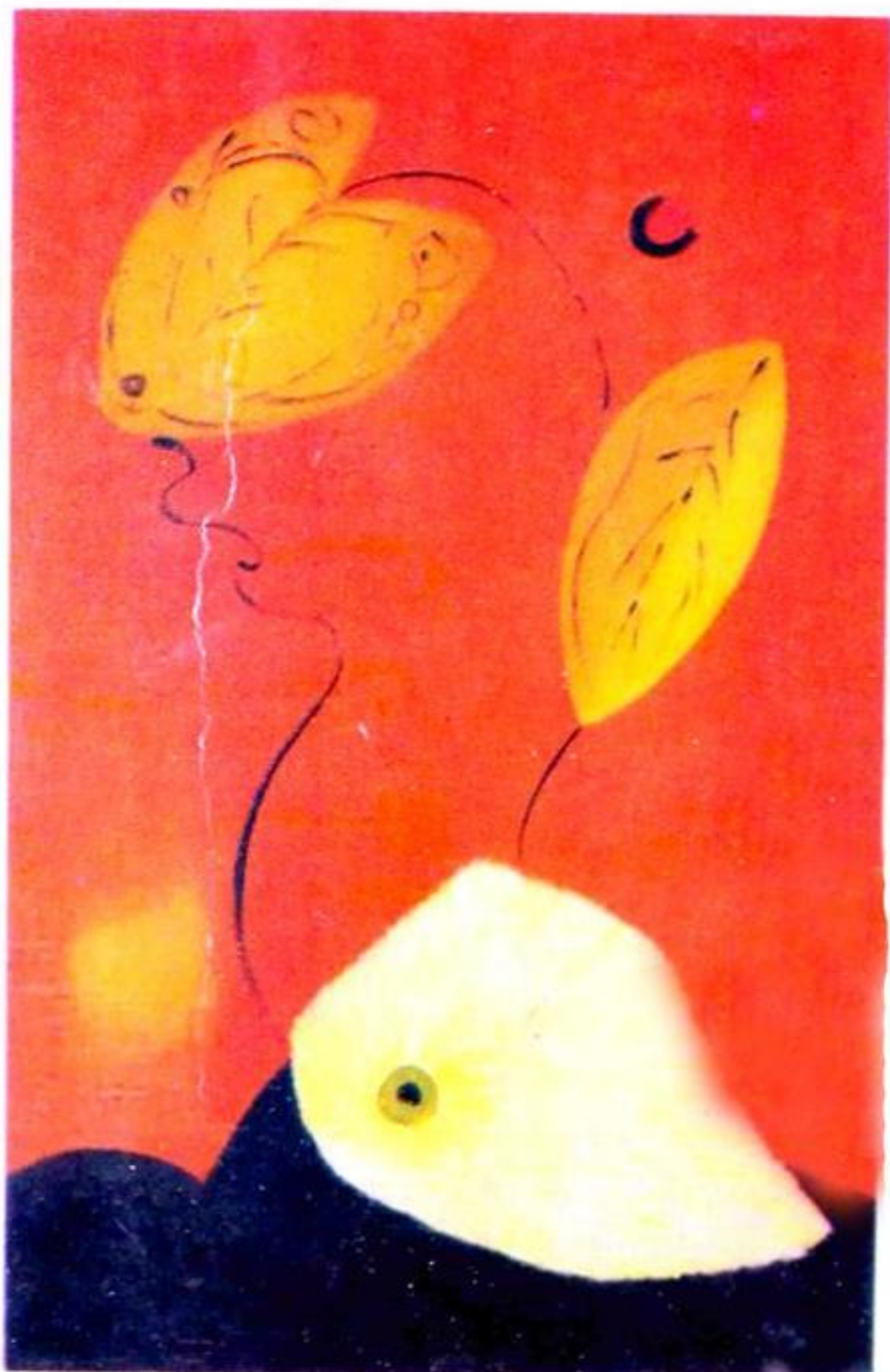


خوابِ گل پریشاں ہے

احمد فراز



خوابِ گل پریشانی ہے

احمد فراز

KHUAB-E-GUL PARESHAN HAI

(Urdu Poetry)

by

AHMAD FARAZ

Year of Edition 2002

ISBN-81-87666-19-6

Price. Rs. 80/=

1910-2001

خواب گل پریشاں ہے

.. احمد فراز

۲۰۰۲ء

۸۰ روپے

کاک پرنٹرس، دہلی

نام کتاب

.. مصنف

سن اشاعت

قیمت

مطبع

Published by:

Kitabi Duniya

1955, Turkman Gate, Delhi-6 (INDIA)

E-mail kitabiduniya@rediffmail.com

حمید اخوند
کے نام

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں، برسِ عام رکھ دیا

ترتیب

9	احمد ندیم قاسمی	احمد فراز کی شاعری
13		انتساب
16		سنا ہے لوگ اے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
20		ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں
22		وہ تفتاد تہیں ہیں مرے خدا کہ یہ تو نہیں کوئی اور ہے
24		To let
26		نہ جانے ظرف تھا کم یا انا زبادہ تھی
27		سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
28		اس نے سکوت شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
30		وہ شام کیا تھی
36		نذرِ جالب
38		اک دست شناس نے مجھ سے کہا ترے ہاتھ کی ریکھائیں ہیں عجب
40		ادھر اک دل، ادھر ساری خدائی

- 44 بہار آئی تو کیا کیا یاد آئی
- 48 بھلی سی ایک شکل تھی
- 54 آنکھوں میں ستارے تو کئی شام سے اترے
- 56 ساقیا ایک نظر جام سے پہلے پہلے
- 58 دکھ پھپھائے ہوئے ہیں ہم دونوں
- 60 یہ کوئی دل کی مستحیلی پہ بے صحرار کھے
- 62 کسی دل سے باب قبول تک جو مسافرتیں ہیں دعاؤں کی
- 64 طناب خمیمہ نہ موج بلا سے ڈر کر کھینچ
- 66 غنیم سے
- 69 اب وہ کہتے ہیں
- 72 ہجر جاناں کی گھڑی اچھی لگی
- 74 ہوئے جاتے ہیں کیوں غمخوار قاتل
- 76 فراق و وصل کیا ہیں، عاشقی کے تجربے ہیں
- 78 نئے سفر میں ابھی ایک نقص باقی ہے
- 79 تجربہ پر بھی نہ ہو گمان میرا
- 81 اک شب تھا وہ مہمان میرا

- 83 کالی دیوار
- 87 بنگلہ دیش
- 90 کسی جانب سے بھی پرہم نہ ہو کا نکلا
- 92 غم رگ و پے میں نہیں جب سے شرارے کی مثال
- 94 ہونٹ حیردوں سے نہ چہرہ ہے ستارے کی مثال
- 96 دوستویوں بھی نہ رکھو غم دہیانہ کھلے
- 98 من و تو
- 107 تجھ سے مل کر تو یہ لگتا ہے کہ اے اجنبی دوست
- 109 تہام بزم تھی مشتاق حرف بابت دوست
- 111 فقط حنر ہی نہیں، عیب بھی کمال کے رکھ
- 112 شب نشاط تھی یا صبح پر ملال تھی وہ
- 114 تو جو پابے تو نہیں ہوں، تو جو پابے تو میں ہوں
- 116 خوابوں کے بیوپاری
- 121 دکھ فسانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
- 123 اس سے پہلے کہ بے دنا ہو جائیں
- 125 وہ تری طرح کوئی اور تھی

- 131 ہجمن میں نغمہ سرائی کے بعد یاد آئے
- 132 یہ دکھ آساں نہ تھے جاناں
- 135 تم کہ سنتے رہے اوروں کی زبانی لوگو
- 139 عشق نشہ ہے نہ جادو جو اتر بھی جائے
- 141 تو کس طرح سے یہ احساں مگر اتارے گا
- 142 میں دھوکا دوں، تو دھوکا ہے
- 146 غینم سے بھی عداوت میں حد نہیں مانگی
- 148 خود سے رونمویوں تو کسی روز نہ خود سے بولوں
- 149 تجھے کیا خبر کہ جاناں
- 153 روز روشن بھی ترا لوحِ سیاہ بھی تیری

احمد فراز کی شاعری۔۔ ایک مختصر تاثر

چند ہفتے پہلے کا واقعہ ہے کہ احمد فراز، امجد اسلام امجد، سجاد بابر اور میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے احرام باندھے مکہ مکرمہ پہنچے۔ ہم طواف کعبہ مکمل کر چکے اور سعی کے لیے صفاد مردہ کا رخ کرنے والے تھے کہ ایک خاتون لپک کر آئی اور احمد فراز کو بصد شوق مخاطب کیا۔ "آپ احمد فراز صاحب ہیں نا؟" فراز نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولی۔ "ذرا سار کیے گا۔ میرے بابا جان کو آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔" وہ گئی اور نہایت بوڑھے بزرگ کا بازو تھامے انہیں فراز کے سامنے لے آئی۔ بزرگ اتنے معمر تھے کہ بہت دشواری سے چل رہے تھے مگر ان کا چہرہ عقیدت کے مارے سرٹ ہو رہا تھا اور ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بولے۔ "سبحان اللہ۔ یہ کتنا بڑا کرم ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے اپنے ہی گھر میں مجھے احمد فراز صاحب سے ملوادیا۔۔۔ وہ احمد فراز جو میرے محبوب شاعر ہیں اور جنہوں نے میری غالب کی روایت کو توانائی بخشی ہے۔" عقیدت کے سلسلے میں انہوں نے اور بہت کچھ کہا: جب ہم ان سے اجازت لے کر سعی کے لیے بڑھے تو میں نے فراز سے کہا۔ "آج آپ کی شاعری پر سب سے بڑے الزام کا ثبوت مل گیا ہے۔" سب نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ "دیکھا نہیں آپ نے۔" یہ "نین ایجر" فراز سے کتنی فریفتگی کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نین ایجر کی عمر اسی پچاسی سے متجاوز تھی۔

"فراز نین ایجر کا شاعر ہے۔۔۔۔" فراز صرف عثمان شہاب میں داخل ہونے والوں کا شاعر ہے۔۔۔۔" فراز کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوان طلبہ کا شاعر ہے اور بس۔۔۔۔ فراز پر یہ الزامات ہر طرف سے وارد ہوتے رہے ہیں مگر وہ اس الزام تراشی سے بے نیاز، نہایت خوب صورت شاعری تخلیق کیے جا رہا ہے۔ اگر حسن و جمال اور عشق و محبت کی اعلیٰ درجے کی شاعری گھنٹیا ہوتی تو یہ

اور غالب، بلکہ دنیا بھر کے عظیم شاعروں کے ہاں گھنٹیا شاعری کے انباروں کے سوا اور کیا ہوتا۔ فراز کی شاعری میں بیشتر یقیناً حسن و عشق ہی کی کار فرمایاں ہیں اور یہ وہ موضوع ہے جو انسانی زندگی میں سے خارج ہو جائے تو انسانوں کے باطن صمراؤں میں بدل جائیں، مگر فراز تو بھرپور زندگی کا شاعر ہے۔ وہ انسان کے بنیادی جذبوں کے علاوہ اس آشوب کا بھی شاعر ہے جو پوری انسانی زندگی کو محیط کیے ہوئے ہے۔ اس نے جہاں انسان کی محرومیوں، منفلومیوں اور شکستوں کو اپنی غزل و نظم کا موضوع بنایا ہے، وہیں نظم و جبر کے عناصر اور آمریت و مطلق العنانی پر بھی نوٹ نوٹ کر برسا ہے اور اس سلسلے میں غزل کا ایسا ایسا شعر کہا ہے اور ایسی ایسی نظم لکھی ہے کہ پڑھتے یا سنتے ہوئے اس کے مداحین جھونکتے ہیں اور اس کے معترضین کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ یہ دونوں پہلو زندگی کی حقیقت کے پہلو ہیں اور حقیقت ناقابل تقسیم ہوتی ہے۔

ایک بات ایک معروف شاعر نے چند دوسرے ہر دل عزیز شاعر کے علاوہ احمد فراز پر بھی تک بندی کا الزام عائد کر دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ شاعر اگر احمد فراز کا سا ایک شعر بھی کہہ لیتے تو اس احساس کمتری کا مقابلہ کرنے کا تکلف نہ فرماتے۔ مثال کے طور پر فراز کے صرف دو شعر دیکھیے۔ اگر یہ تک بندی ہے تو نہ جانے اعلیٰ معیار کی شاعری کے کہتے ہیں:

ذکر اس غیرت مریم کا جب آتا ہے فراز
گھنٹیاں بجتی ہیں لختوں کے کلیساؤں میں

آج اس نے شرف ہمسفری بخشا تھا
اور کچھ ایسے کہ مجھے خواہش منزل نہ رہی

میں صرف ان دو شعروں کے حوالے سے کہوں گا کہ جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو مجھے ان میں پوری فارسی اور اردو غزل کی دل آویز روایات گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔

احمد فراز کے والد مرحوم اردو کے علاوہ فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے۔ پھر فراز کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی جہاں بیدل، سعدی، حافظ، عرفی، نظیری اور غالب کی فارسی شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ کوہاٹ اور پشاور میں اردو شعر و شاعری کا ایک بھرپور ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فراز

خواب گل پریشان ہے

کی غزل دراصل صنف غزل کی تمام روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ انہار کا نام ہے۔ اس کا ایک ایک مصرع ایسا گنٹھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک لفظ کی تبدیلی کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ اور چونکہ فراز کی غزل تکمیل (PERFECTION) کی انتہا ہے اس لیے جب وہ نظم کہتا ہے، تو اس کی بھی ایک ایک لائن برجستہ اور بے ساختہ ہوتی ہے۔ چنانچہ احمد فراز غزل اور نظم کا ایسا شاعر ہے جو دور حاضر کے چند گنے چنے معتبر ترین شعراء میں شمار ہوتا ہے۔

یہ جو بعض لوگ دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ فراز کے ہاں حسن و عشق کی نرمیوں کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب کی جو لکار ہے وہ اسے تضادات کا شکار بنا دیتی ہے، تو یہ حضرات اتنا بھی نہیں جانتے کہ حسن و عشق کی منازل سے گزرے بغیر انقلاب کی لکار اعتماد سے محروم رہتی ہے اور وہی شعراء صحیح انقلابی ہوتے ہیں جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں کے اندازہ داں ہوتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ فراز کا یہ کمال بھی لائق صد تحسین ہے کہ کوڑی آزمائشوں میں سے گزرنے کے باوجود وہ اپنی انقلابی شاعری میں بھی سچا شاعر رہا ہے۔ وہ نعرہ زنی نہیں کرتا، صورت حال کا تجزیہ کرتا ہے اور پڑھنے سننے والوں کو اپنی سوچ کے مطابق سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ صد فی صد درست ہے کہ:

دیکھو تو بیاضِ شعر میری

اک حرف بھی سرنگوں نہیں ہے

فراز کے یہ نام نہاد "تضادات" تو اس کے فن کی توانائی ہیں۔ بصورت دیگر وہ ذات اور کائنات کو ہر شے کیسے کر سکتا تھا اور اس طرح کے شعر کیسے کہہ سکتا تھا کہ:

تم اپنی شمعِ تمنا کو رو رہے ہو فراز

ان آندھیوں میں تو پیارے چراغِ سب کے گئے

خود آگاہی کا یہ وہ مقام ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے عمریں درکار ہوتی ہیں۔

میں فراز کے شاعرانہ کمالات کے اس نہایت مختصر تاثر کے آخر میں اس کی غزل میں تغزل کی اس بھرپور فضا سے لذت اندوز ہونا چاہتا ہوں جو غزل کی سی لطیف صنفِ سخن کی سچی شناخت ہے۔ یہ صرف چند اشعار ہیں جو اس وقت یادداشت میں تازہ ہیں:

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند از گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

بقا ہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار، مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

یہ ۱۰۱ کی غزل ہے جس پر احمد فراز نے ساہا سال تک حکمرانی کی ہے اور جو اردو شاعری کی
تاریخ میں ایک الگ باب کی متقاضی ہے۔

احمد ندیم قاسمی

خواب گل پریشان ہے

انتساب

ہماری چاہتوں کی بزدلی تھی

ورنہ کیا ہوتا

اگر یہ شوق کے مضمون

وفا کے عہد نامے

اور دلوں کے مرثیے

اک دوسرے کے نام کر دیتے

زیادہ سے زیادہ

چاہتیں بد نام ہو جاتیں

ہماری دوستی کی داستانیں عام ہو جاتیں

تو کیا ہوتا

یہ ہم جو زیست کے ہر عشق میں سچائیاں سوچیں

یہ ہم جن کا اناٹہ تنگی، تنہائیاں، سوچیں

یہ تحریریں

ہماری آرزو مندی کی تحریریں

ہم پیوستگی اور خواب پیوندی کی تحریریں

فراق و وصل و محرومی و خورسندی کی تحریریں

ہم ان پر منفعل کیوں ہوں

یہ تحریریں

اگر اک دوسرے کے نام ہو جائیں

تو کیا اس سے ہمارے فن کے رسیا

شعر کے مذاح

ہم پر تمہتیں دھرتے

ہماری ہمدی پر طنز کرتے

اور یہ باتیں

اور یہ افواہیں

کسی پہلی نگارش میں

ہمیشہ کے لیے مرقوم ہو جائیں

ہماری ہستیاں مذموم ہو جائیں

خواب گل پریشان ہے

نہیں ایسا نہ ہوتا
اور اگر بالفرض ہوتا بھی
تو پھر ہم کیا
سبک سارانِ شہرِ حرف کی چالوں سے ڈرتے ہیں؟
رگانِ کوچہ۔ شہرت کے غوغا
کالے بازاروں کے دالوں سے ڈرتے ہیں؟
ہمارے حرف جذبوں کی طرح
سچے ہیں، پاکیزہ ہیں، زندہ ہیں
بلا سے ہم اگر مصلوب ہو جاتے
یہ سودا کیا بڑا تھا
گر ہماری قبر کے کتبے
تمہارے اور ہمارے نام سے منسوب ہو جاتے!



سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے درد کی گاہک ہے چشم ناز اُس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کو بھی ہے شعرو شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں

خواب گل پریشان ہے

سنا ہے بولے تو باتوں سے چسول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات سے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دن کو اسے ستیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو مہن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اس کی
سنا ہے شام کو ساتے گزر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کی سیاہ چشمنگی قیامت ہے
سو اُس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دحر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئینہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے حامل ہیں اس کی گردن میں
مزاج اور ہی لعل و گہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے چشمِ تصور سے دشتِ امکاں میں
پلنگِ زاویے اس کی کمر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

وہ سرو قد ہے مگر بے گلِ مراد نہیں
کہ اس شجر پہ شگوفے ثمر کے دیکھتے ہیں

سب اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے شبستاں سے متصل سے بہشت
مکین اُدھر کے بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں

رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کسے نصیب کہ بے پیر حن اسے دیکھے
کبھی کبھی در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں



ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں
فراز اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں

جدائیاں تو مقدر ہیں پھر بھی جانِ سفر
کچھ اور دور ذرا ساتھ چل کے دیکھتے ہیں

رہِ وفا میں حریفِ خرام کوئی تو ہو
سو اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں

تُو سامنے ہے تو پھر کیوں یقین نہیں آتا
یہ بار بار جو آنکھوں کو مل کے دیکھتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں موجود تیری محفل میں
جو لالچوں سے تجھے، مجھ کو جل کے دیکھتے ہیں

یہ قُرب کیا ہے کہ یکجاں ہوتے نہ دُور رہے
ہزار ایک ہی قالب میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

نہ تجھ کو مات ہوتی ہے نہ مجھ کو مات ہوتی
سواب کے دونوں ہی چالیں بدل کے دیکھتے ہیں

یہ کون ہے سرِ ساحل کہ ڈوبنے والے
سمندروں کی تہوں سے اچھل کے دیکھتے ہیں

ابھی تلک تو نہ کندن ہوتے نہ راکھ ہوتے
ہم اپنی آگ میں ہر روز جل کے دیکھتے ہیں

بہت دنوں سے نہیں ہے کچھ اس کی خیر خیر
چلو فراز کو، اے یار چل کے دیکھتے ہیں



وہ تبادلتیں ہیں مرے خدا کہ یہ تو نہیں کوئی اور ہے
کہ تو آسمان پہ ہو تو ہو، پہ سرِ زمیں کوئی اور ہے

وہ جو راستے تھے وفا کے تھے یہ جو منزلیں ہیں سزا کی ہیں
مرا ہمسفر کوئی اور تھا مرا ہممنشیں کوئی اور ہے

مرے جسم و جاں میں ترے سوا نہیں اور کوئی بھی دو سرا
مجھے پھر بھی لگتا ہے اس طرح کہ کہیں کہیں کوئی اور ہے

میں اسیر اپنے غزال کا میں فقیرِ دشتِ وصال کا
جو بہن کو باندھ کے لے گیا وہ بکتگیں کوئی اور ہے

خواب گل پریشان ہے

میں عجب مسافرِ بے اماں کہ جہاں جہاں بھی گیا وہاں
مجھے یہ لگا مرا خاکداں یہ زمیں نہیں کوئی اور ہے

رہے بے خبر مرے یار تک، کبھی اس پہ شک، کبھی اُس پہ شک
میرے جی کو جس کی رہی لک، وہ قمر جبیں کوئی اور ہے

یہ جو چار دن کے ندیم ہیں انہیں کیا فراز کوئی کہے
وہ محبتیں وہ شکائتیں ہمیں جس سے تھیں کوئی اور ہے

To Let

میں تیرے لطفِ فراواں کا معترف ہوں مگر
حسین و خندہ جبیں مسیزبان تھی وہ بھی

مطابقت تو نہیں پر مماثلت ہے بہت
تو آسمان سہی ساتبان تھی وہ بھی

تو میرے شام و سحر کا خیال رکھتی ہے
تری طرح ہی بہت مہربان تھی وہ بھی

تجھے بھی لوگ بڑی چاہتوں سے دیکھتے ہیں
نگاہِ اہلِ تمنا کی جان تھی وہ بھی

خواب گل پریشان ہے

تو ایک حرف و حکایت کے سلسلے کی طرح
طلسم ہو شربا داستان تھی وہ بھی

تو لے اڑی ہے بچھے جس طرح نشے کی طرح
جو سچ کہوں تو مزے کی اڑان تھی وہ بھی

میں اپنے گھر کی طرح اس میں بس گیا تو کھلا
کراتے کے لیے خالی مکان تھی وہ بھی



نہ جانے ظرف تھا کم یا انا زیادہ تھی
کلاہ سر سے تو قد سے قبا زیادہ تھی

رمیدگی تھی تو پھر ختم تھا گریز اس پر
سپردگی تھی تو بے انتہا زیادہ تھی

غرور اس کا بھی کچھ تھا جراثیوں کا سبب
کچھ اپنے سر میں بھی شاید ہوا زیادہ تھی

وفا کی بات الگ پر جسے جسے چاہا
کسی میں حسن، کسی میں ادا زیادہ تھی

فراز اس سے وفا مانگتا ہے جاں کے عوض
جو سچ کہیں تو یہ قیمت ذرا زیادہ تھی



سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

شکوہ۔ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جلاتے

کتنا آساں تھا ترے، بھر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

اس کی وہ جانے اسے پاسِ وفا تھا کہ نہ تھا
تم فراز اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے



اس نے سکوتِ شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
بہجر کی رات بام پر ماہِ تمام رکھ دیا

آئیدِ دوست کی نوید کوئے وفا میں گرم تھی
میں نے بھی اک چراغِ سادل سرِ شام رکھ دیا

ثندتِ تنگی میں بھی غیرتِ میکشی رہی
اس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا

اُس نے نظرِ نظر میں ہی ایسے بھلے سخن کہے
میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا

خواب گھل پریشان ہے

دیکھو یہ مسیرے خواب تمھے دیکھو یہ مسیرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں بر مسرِ عام رکھ دیا

اب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
کبکِ دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا

جو بھی ملا اسی کا دل حلقہ بگوشِ یار تھا
اس نے تو سارے شہر کو کر کے غلام رکھ دیا

اور فراز چاہتیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

وہ شام کیا تھی

وہ شام کیا تھی جب اس نے بڑی محبت سے
کہا کہ تُو نے یہ سوچا بھی ہے کبھی احمد

خدا نے کتنی تجھے نعمتیں عطا کی ہیں
وہ بخششیں کہ ہیں بلا تر از شمار و عدد

یہ خال و خد یہ وجاہت یہ تندرست بدن
گر حتی گو نختی آواز استوار جسد

بسانِ لالہ۔ صحرا تپاں تپاں چہرہ
مثالِ نخلِ کہتاں دراز قامت و قد

خوابِ مہل پریشان ہے

اگرچہ نام و نسب کا نہیں ہے تو قاتل
پہ ہیں قبیلہ۔ سادات سے ترے اب و جد

بجائے خود ہمنرِ شاعری ہے اک انعام
پھر اس پہ اور شرف ہے قبولیت کی سند

ترے کلام پہ یہ قول صادق آتا ہے
کہ شعرِ خوب ز دل خیزد و بہ دل ریزد

کبھی غزل سنو تیری تو ایسا لگتا ہے
درونِ نئے چوں دلِ نئے نوازی نالد

ترا نہالِ سخن بارور ہوا کیا کیا
اگرچہ سایہ کناں تجھ پہ تھے کتنی برگد

قبولِ عام نے تجھ کو وہ آبرو بخشا
کہ خلقِ پیار کرے تجھ سے اور حریفِ حسد

محببتیں تجھے اتنی ملیں کہ دل میں ترے
نہ دشمنی نہ عداوت نہ ضد نہ بغض نہ کہ

تو اپنے عصر میں ممتاز ہے یہی ہے بہت
چراغ کس کا وگرنہ جلا ہے تا بہ ابد

اگر ہو محفلِ خوباں تو جانِ محفلِ تُو
اگر ہو حلقہٴ رنداں تو، تُو سرِ مسند

کسبھی ہے رقصِ کناں نعرہ زنِ سرِ بازار
کسبھی ہے راندہٴ دربارِ صورتِ سرمد

امیرِ شہر کی نظروں میں مفسد و سرکش
خطیبِ شہر کے خطبوں میں کافر و مرتد

کسبھی وطنِ بدری کے عذابِ جاں لیوا
کسبھی اسیری و درماندگی کی ساعتِ بد

خوابِ گل پریشان ہے

اگر کریں جو تقابل ترے مصائب کا
زمانہ سخت کم آزار تھا بجانِ امد

سو یہ بھی ایک ہے اعزازِ اہلِ دل کے لیے
سو یہ بھی دین ہے اس کی بہر کے نہ دہد

نہ تیرے دوش پہ خلعت کوئی کفن کی طرح
نہ تیرے سر پہ ہے دستارِ کبر کا گنبد

سعادت ایست کہ ہرگز بزورِ بازو نیست
”کہ تانہ رحمتِ پروردگار می بخشد“

میں بت بنا رہا سنتا رہا بیانِ صنم
چوں پیش آتہ رو آتہ نفس نہ کشد

وہ خود غزل تھی سو جائز مبالغے اس کے
مگر نہ یوں بھی کہ چھولیں غلو و کذب کی حد

وہ بولتی گئی جذبات کے بہاؤ میں تھی
وہ کہہ رہی تھی خرد کو جنوں، جنوں کو خرد

جب اس کی ہوش رہا گفتگو تمام ہوتی
تو اس سے میں نے کہا اے قرارِ جان و جسد

میں کب رہا ہوں مگر اس کی ذات سے غافل
کہ جس کی مجھے پہ رہیں مہربانیاں بے حد

یہ رنگ و نقش یہ حرف و نوا یہ صحتِ جاں
یہ شاعری یہ شرف سب اسی کی داد و مدد

یہ فن بہانہ ہے اظہارِ دردِ دل کے لیے
نہ یہ کہ شہرہ و شہرت تھا گوہرِ مقصد

مگر مرے لیے سو بخششوں کی اک بخشش
مری طلب کے بیابان میں تری آمد

خوابِ گل پریشان ہے

ترے ہی طلعت و گیو کی دھوپ چھاؤں ہے
کہاں کی صبح بنارس کہاں کی شامِ اودھ

تو خود بہارِ شمال ہے دادِ خواہ ترے
گلاب و لالہ و نسریں و نسترن کے بہ

ترا جمال ترا التفات تیری وفا
مرے دیارِ تمنا کی آخری سرحد

مرا وجود مرے خوابِ مسیری دولتِ فن
تری ہی نذر ہیں اے جاں اگر قبولِ اہد

کجا ست سنگِ درِ یارِ من کہ دل بہ نہم
بر آستانہ۔ شاہاںِ فراز پا نہ نہد

(نذرِ جالب)

کب تک درد کے تحفے بانٹو خونِ جگر سوغات کرو
"جالب ہُن گل تک گئی اے"، ہُن جان نوں ہی خیرات کرو

کیسے کیسے دشمنِ جاں اب پر سشِ حال کو آتے ہیں
ان کے بڑے احسان ہیں تم پر اٹھو تسلیات کرو

تم تو ازل کے دیوانے اور دیوانوں کا شیوہ ہے
اپنے گھر کو آگ لگا کر روشن شہر کی رات کرو

اے بے زور پیارے تم سے کس نے کہا کہ یہ جنگ لڑو
شاہوں کو شہہ دیتے دیتے اپنی بازی مات کرو

خواب گل پریشان ہے

اپنے گریباں کے پرچم میں لوگ تمہیں کفنائیں گے
چاہے تم منصور بنو یا پیروی۔ سادات کرو

فیض گیا اب تم بھی چلے تو کون رہے گا مقتل میں
ایک فراز ہے باقی ساتھی، اس کو بھی اپنے ساتھ کرو



اک دست شناس نے مجھ سے کہا ترے ہاتھ کی ریکھائیں ہیں عجب
تیرے پاؤں انوکھی بیڑی ہے ترے گلے میں ملائیں ہیں عجب

ترے پیار کے کتنے قصے ہیں تری ذات کے کتنے حصے ہیں
کہیں رام ہے تو کہیں راون ہے، تری پیت کی چرپائیں ہیں عجب

کبھی ندیا جیسے بول کہے کبھی ساگر جیسا شور کرے
ترا بھید بھرا لہجہ نہ کھلے تری ساری کویتائیں ہیں عجب

کتنی تجھ کو دنیا دار کہیں کتنی لوگ تجھے اوتار کہیں
ترا جیون ٹمک جیسا ہے ترے نام کی لیلائیں ہیں عجب

خواب مٹل پریشان ہے

کسبھی پریم کارس چھڑکاتے تُو کسبھی برہا بس پُچکانے تو
کسبھی زہر ہے تُو کسبھی امرت ہے ترے دھیان کی گیتائیں ہیں عجب

کوئی گوپی تجھ کو جان کہے کوئی دیوی تجھ پر مان کر سے
تو کرشن نہ شام مگر پھر بھی تری رسیا رادھائیں ہیں عجب

تو اک ستوالہ چٹھی ہے اس شاخ اڑے اس باک پھر سے
کیا ٹھسور ٹھکانہ ہو تیرا ترے من کی دنیا تیں ہیں عجب

کسبھی اوس سے پیاس بھجاتے تُو کہیں دریا کو ٹھکراتے تُو
تیرا ہنستا چہرہ اور لگے تری آنکھوں کی برکھائیں ہیں عجب

تو بخارہ یا جوگی ہے، تو کوی ہے یا کوئی روگی ہے
تو گیانی ہے یا مور کہ ہے ترے بارے میں سب راتیں ہیں عجب



ادھر اک دل ادھر ساری خدائی
دہائی ہے خداوندا دہائی

فقیروں کی وہی ہڈیاں نویسی
خطیبوں کی وہی ہرزہ سرائی

کسی کے سر پہ دستارِ ریا ہے
کسی کے تن پہ دلقِ کبریائی

نہ یہ شائستہ۔ وصلِ صنم ہیں
نہ وہ سرگشتہ۔ رسمِ خدائی

خواب گل پریشان ہے

ہوتی ہے عام اب صحرا فروشی
بہت ہے ان دنوں دریا نہائی

یہاں اندھے ہیں آئینوں کے گاہک
یہاں گونگوں کو زعمِ خوشنوائی

وفا کیسی کہاں کی دوستداری
جہاں اجباب ہوں یوسف کے بھائی

محبت کا صلہ کیا ہے مگر ہاں
ملامت، طعن، تہمت، جگ ہنائی

خوشی کیا ہے گئی تو عمر بھر کو
گھڑی بھر کے لیے آئی تو آئی

”ق“

دِلا تو کس ڈگر پر چل دیا ہے
یہاں راہی کی منزل نارسائی

گرہ جب بھی پڑی کارِ جنوں میں
خرد کب ناخنِ تدبیر لائی

وہاں بے سود ہے شکوہ شکایت
جہاں وضعِ جہاں ہو کج ادائی

نہیں نوحہ گری تیرا قرینہ
نہیں شمیوہ ترا ماتم سمرائی

خواب گل پریشان ہے

ترا مسلک محبت ہے محبت
بلا سے راس آتی یا نہ آتی

فضا میں اجنبی تاریکیاں ہیں
جلا کوئی چراغِ آشنائی

اٹھا ساغر کہ دنیا چار دن ہے
قیامت کی گھڑی آتی کہ آتی

سجا محفل کہ تیرا ہمنشین ہے
وہ بت، چاہے جسے ساری خدائی

سنا ایسی غزل کوئی کہ پیارے
نہیں اب تک کسی مطرب نے گائی



بہار آئی تو کیا کیا یاد آئی
تری خوش قامتی لالہ قبائی

تصور نے عجب باندھا ہے نقشہ
تخیر نے گرہ منہ پر لگائی

نہ کوئی سامنے تھا استعارہ
نہ کوئی ذہن میں تشبیب آئی

فروغِ حسن سے خیرہ تھیں آنکھیں
سو ایرِ زلف نے چلمن گرائی

خوابِ گل پریشان ہے

ودیعت ہے تری جلوہ گری کی
جو حیرت آتہ خانوں نے پائی

تری آنکھوں کے آگے کب سے زرگس
کھڑی ہے لے کے کشکولِ جدائی

نشاطِ وصل سے ہیں تلیاں مست
دُحلا سبزے سے زنگارِ جدائی

کوئی بھنورا اڑا ہے گنگناتا
کلی نے آنکھ کھولی مسکراتی

عنادل ٹوٹ کر ہیں زمزمہ خواں
گلابوں کا زرِ ناکتہ دانی

ہوا اپنی نمی سے آپ بوجھل
فضا رنگوں کی بارش میں نہائی

لگی تھی رنگِ گل سے باغ میں آگ
صبا پاؤں کہیں رکھنے نہ پاتی

قصیدہ اک بہارِ ناز کا تھا
سو مثلِ برگِ گل تشبیب آتی

زلیخائے سخن نے مدتوں بعد
قبا کے بند کھولے گنگنائی

غزل میں ہو گیا خونِ جگر صرف
کہاں کی لوح کسی روشنائی

پر طاؤس کی صورت ہے قرطاس
قلم نے موقلم کی چھب دکھائی

گریز آساں کہاں جب طبعِ شاعر
ہو سرمستِ مئے نغمہ سرائی

ادھر موزوں طبیعت موج پر ہو
ادھر مضمون ہو تیری دلربانی

کب آیا زنگِ الفت آتے پر
جی ہے کب کسی دریا پہ کئی

بہت دن ہو گئے تھے شعر لکھے
نہ آمد تھی نہ فصلِ لب کشائی

غمِ دنیا میں سرگرداں تھے ایسے
نہ دل رویا نہ تیری یاد آئی

تھے کھویا تو یوں لگتا ہے جیسے
گنوا دی زندگی بھر کی کمانی

ترا احمد فراز اب بھی ترا ہے
کجائی اے نگارِ من کجائی

بھلی سی ایک شکل تھی

بھلے دنوں کی بات ہے
بھلی سی ایک شکل تھی
نہ تھی کہ حسنِ تام ہو
نہ دیکھنے میں عام سی

نہ یہ کہ وہ چلے تو کہکشاں سی رہگزر لگے
مگر وہ ساتھ ہو تو پھر بھلا بھلا سفر لگے

کوئی بھی رت ہو اس کی چھب
فضا کا رنگ روپ تھی
وہ گرمیوں کی چھاؤں تھی
وہ سردیوں کی دھوپ تھی

خواب گھل پریشان ہے

نہ مدتوں جدا رہے
نہ ساتھ صبح و شام ہو
نہ رشتہ۔ وفا پہ ضد
نہ یہ کہ اذنِ عام ہو

نہ ایسی خوش لباسیاں
کہ سادگی گلہ کرے
نہ اتنی بے تکلفی
کہ آئینہ حیا کرے

نہ اختلاط میں وہ رم
کہ بد مزہ ہوں خواہشیں
نہ اس قدر سپردگی
کہ زچ کریں نوازشیں

نہ عاشقی جنون کی
کہ زندگی عذاب ہو
نہ اسقدر کٹھور پن
کہ دوستی خراب ہو

کبھی تو بات بھی خفی
کبھی سکوت بھی سخن
کبھی تو کشتِ زعفران
کبھی اداسیوں کا بن

○

سنا ہے ایک عمر ہے
معاملاتِ دل کی بھی
وصالِ جانفزا تو کیا
فراقِ جانگسل کی بھی

سو ایک روز کیا ہوا
وفا پہ بحث چھڑ گئی
میں عشق کو امر کہوں
وہ میری ضد سے چڑ گئی

میں عشق کا اسیر تھا
وہ عشق کو قفس کہے
کہ عمر بھر کے ساتھ کو
وہ بدتر از ہوس کہے

”شجر حجر نہیں کہ ہم
ہمیشہ پابہ گل رہیں
نہ ڈھور ہیں کہ رتیاں
گلے میں مستقل رہیں

محبتوں کی دستیں
ہمارے دست و پا میں ہیں
سب ایک در سے نسبتیں
رنگِ باوفا میں ہیں

میں کوئی پیننگ نہیں
کہ اک فریم میں رہوں
وہی جو من کا میت ہو
اسی کے پریم میں رہوں

تمہاری سوچ جو بھی ہو
میں اس مزاج کی نہیں
مجھے وفا سے بیر ہے
یہ بات آج کی نہیں

نہ اس کو مجھ پہ مان تھا
نہ مجھ کو اس پہ زعم ہی
جو عہد ہی کوئی نہ ہو
تو کیا غمِ شکستگی

سو اپنا اپنا راستہ
ہنسی خوشی بدل دیا
وہ اپنی راہ چل پڑی
میں اپنی راہ چل دیا

بھلی سی ایک شکل تھی
بھلی سی اس کی دوستی
اب اس کی یاد رات دن
نہیں، مگر کبھی کبھی



آنکھوں میں ستارے تو کئی شام سے اترے
پر دل کی اداسی نہ در و بام سے اترے

کچھ رنگ تو ابھرے تری گل پیرہنی کا
کچھ رنگ تو آئینہ ایام سے اترے

ہوتے رہے دل لمحہ بہ لمحہ تہہ و بالا
وہ زینہ بہ زینہ بڑے آرام سے اترے

جب تک ترے قدموں میں فروکش ہیں سبوکش
ساقی خطِ بادہ نہ لبِ جام سے اترے

خواب گل پریشان ہے

بے طمع نوازش بھی نہیں سنگدلوں کی
شائد وہ مرے گھر بھی کسی کام سے اترے

اوروں کے قصیدے فقط آورد تھے جاناں
جو تجھ پہ کہے شعر وہ الہام سے اترے

اے جانِ فراز اے مرے ہر دکھ کے میسجا
ہر زہر زمانے کا ترے نام سے اترے



ساقیا ایک نظرِ جام سے پہلے پہلے
ہم کو جانا ہے کہیں شام سے پہلے پہلے

نو گرفتارِ وفا، سعی۔ رہائی ہے عبث
ہم بھی الجھے تھے بہت دام سے پہلے پہلے

خوش ہو اے دل کہ محبت تو نبھادی تو نے
لوگ اُجڑ جاتے ہیں انجام سے پہلے پہلے

اب ترے ذکر پہ ہم بات بدل دیتے ہیں
کتنی رغبت تھی ترے نام سے پہلے پہلے

خواب گل پریشان ہے

سامنے عمر پڑی ہے شبِ تنہائی کی
وہ مجھے چھوڑ گیا شام سے پہلے پہلے

کتنا اچھا تھا کہ ہم بھی جیا کرتے تھے فراز
غیر معروف سے، گننام سے، پہلے پہلے



دکھ چھپاتے ہوئے ہیں ہم دونوں
زخم کھاتے ہوئے ہیں ہم دونوں

ایسا لگتا ہے پھر زمانے کو
یاد آتے ہوئے ہیں ہم دونوں

تُو کبھی چاندنی تھی دھوپ تھا میں
اب تو ساتے ہوئے ہیں ہم دونوں

جیسے اک دوسرے کو پا کر بھی
کچھ گنوائے ہوئے ہیں ہم دونوں

خواب مٹل پریشان ہے

جیسے اک دوسرے سے شرمندہ
سر جھکاتے ہوتے ہیں ہم دونوں

جیسے اک دوسرے کی چاہت کو
اب بھلاتے ہوتے ہیں ہم دونوں

عشق کیا کہاں کا عہد فراز
گھر بساتے ہوتے ہیں ہم دونوں



ہر کوئی دل کی ہتھیلی پہ ہے صحرا رکھے
کس کو سیراب کرے وہ کے پیسا رکھے

عمر بھر کون نبھاتا ہے تعلق اتنا
اے مری جان کے دشمن تجھے اللہ رکھے

ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
جو کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے

خوابِ گل پریشان ہے

کم نہیں طمعِ عبادت بھی تو حرصِ زر سے
فقر تو وہ ہے کہ جو دین نہ دنیا رکھے

ہنس نہ اتنا بھی فقیروں کے اکیلے پن پر
جا، خدا میری طرح تجھ کو بھی تنہا رکھے

یہ قناعت ہے اطاعت ہے کہ چاہت ہے فراز
ہم تو راضی ہیں وہ جس حال میں جیسا رکھے



کسی دل سے باپِ قبول تک جو مسافتمیں ہیں دعاؤں کی
یہ لب و کلام کا عجز ہے کہ رعوتیں ہیں خداؤں کی

کبھی شہر جاؤ تو دیکھنا کسی بیوا کی دکان پر
کتی شعر میری بیاض کے کتی لعبتیں مرے گاؤں کی

تجھے دوسروں سے ملا ہے یہ مری جستجو کا صلہ ہے یہ
ترے تخت و تاج سے قیمتی ہے یہ گرد میرے کھڑاؤں کی

یہ عجیب قریہ۔ بے اماں مری جاں حذر کہ یہاں وہاں
جہاں دوستوں کے ہیں ساتباں وہیں ٹولیاں ہیں بلاؤں کی

خوابِ گل پریشان ہے

نہ مزاجِ ابرِ کرم کا ہے نہ علاجِ بارشِ غم کا ہے
تری دوستی کو میں کیا کروں جو نہ دھوپ کی ہے نہ چھاؤں کی

مرے کجگلاہِ کشیدہ سر تو حریمِ دل میں خرام کر
یہ دیار ہے تری سلطنت یہ زمین ہے ترے ناؤں کی

ہے سمندروں کے سفر کی دھن تو فرازِ سن کہ ابھی نہیں
یہ جو چالِ موجِ بلا کی ہے یہ جو نیتیں ہیں ہواؤں کی



طنابِ خیمہ نہ موجِ بلا سے ڈر کر کھینچ
اگر جناب ہے آغوش میں سمندر کھینچ

مرے حریف کھلے دل سے اب شکست بھی مان
نہ یہ کہ فرطِ ندامت سے منہ پہ چادر کھینچ

مبادا کل کسی بسمل پہ رحم آ جائے
کچھ اور روز ابھی تیغِ ناز ہم پر کھینچ

وہ حرف لکھ کہ بیاضِ سخن لہو سے بچے
قلم سے دشمنہ کی صورت لکیر دل پر کھینچ

خوابِ گل پریشان ہے

ہیں منفعل میرے قامت سے تیری دیواریں
حصار تو مرے قد کاٹھ کے برابر کھینچ

نہیں تو اس کے تغافل کا کیا گلہ کرنا
جو حوصلہ ہے تو دامنِ یار بڑھ کر کھینچ

کہ شاعری بھی تو جزوِ پیمبری ہے فراز
سو رنجِ خلقِ خدا صورتِ پیمبر کھینچ

غنیم سے

مرے تن کے زخم نہ گن ابھی
مری آنکھ میں ابھی نور ہے
مرے بازوؤں پہ نگہ کر
جو غرور تھا وہ غرور ہے

ابھی تازہ دم ہے مرا فرس
تنتے معرکوں پہ مٹلا ہوا
ابھی رزم گاہ کے درمیاں
ہے مرا نشان کھلا ہوا

تری چشمِ بد سے رہیں نہاں
وہ تہیں جو ہیں مری ذات کی
مجھے دیکھ قبضہ تیغ پر
ہے گرفت ابھی مرے ہاتھ کی

وہ جو دشتِ جاں کو چمن کرے
یہ شرف تو میرے لہو کا ہے
مجھے زندگی سے عزیز تر
یہ جو کھیل تیغ و گلو کا ہے

تجھے مان جوشن و گرز پر
مرا حرفِ حق مری ڈھال ہے
ترا جور و ظلم بلا سی
مرا حوصلہ بھی کمال ہے

میں اسی قبیلے کا فرد ہوں
جسے ناز صدق و یقین پہ ہے
یہی نامہ بر ہے بہار کا
جو گلاب میری جبیں پہ ہے

اب وہ کہتے ہیں

اب وہ کہتے ہیں تم کوئی چارہ کرو
جب کوئی عہد و پیمان سلامت نہیں
اب کسی کنج میں بے اماں شہر کی
کوئی دل کوئی داماں سلامت نہیں

تم نے دیکھا ہے سر سبز پیڑوں پہ اب
سارے برگ و ثمر خار و خس ہو گئے
اب کہاں خوبصورت پرندوں کی رت
جو نشیمن تھے اب وہ قفس ہو گئے

صحنِ گلزارِ خاشاک کا ڈھیر ہے
اب درختوں کے تن پر قبائیں کہاں
سرو و شمشاد سے قمریاں اڑ گئیں
شاخِ زیتون پر فاحتائیں کہاں

شیخ منبر پہ نا معتبر ہو چکا
رند بدنام کوئے خرابات میں
فاصلہ ہو تو ہو فرق کچھ بھی نہیں
فتوہ دیں میں اور کفر کی بات میں

اب تو سب راز داں ہمنا نامہ بر
کوئے جاناں کے سب آشنا جا چکے
کوئی زندہ گواہی بچی ہی نہیں
سب گنہگار سب پارسا جا چکے

خواب مغل پریشان۔

اب کوئی کس طرح تم بہ اذنی کہے
اب کہ جب شہر کا شہر سمنان ہے
حرف عیسیٰ نہ صور سرافیل ہے
حشر کا دن قیامت کا میدان ہے

مرگ انبوه بھی جشن سماں نہیں
اب کوئی نسل گاہوں میں جائے تو کیا
کب سے توقیر لالہ قبائی گئی
کوئی اپنے لہو میں نہاتے نو کیا



مہجرِ جاناں کی گھڑی اچھی لگی
اب کے تنہائی بڑی اچھی لگی

قریبِ جاں پر ادا سی کی طرح
دھند کی چادر پڑی اچھی لگی

ایک تنہا فاختہ اڑتی ہوتی
اک بہن کی چوکرٹی اچھی لگی

زندگی کی گھپ اندھیری رات میں
یاد کی اک پھلجھڑی اچھی لگی

خواب گل پریشان ہے

شہرِ دل اور اتنے لوگوں کا ہجوم
وہ الگ سب سے کھڑی اچھی لگی

ایک شہزادی مگر دل کی فقیر
اس کو میری جھونپڑی اچھی لگی

دل میں آ بیٹھی غزل سی وہ غزال
یہ تصور کی گھڑی اچھی لگی

تیرا دکھ، اپنی وفا، کارِ جہاں
جو بھی شے مہنگی پڑی اچھی لگی

آنکھ بھی برسی بہت بادل کے ساتھ
اب کے ساون کی جھڑی اچھی لگی

یہ غزل مجھ کو پسند آتی فراز
یہ غزل اس کو بڑی اچھی لگی



ہوئے جاتے ہیں کیوں غمخوار قاتل
نہ تھے اتنے بھی دل آزار قاتل

میسخاؤں کو جب آواز دی ہے
پلٹ کر آگئے ہر بار قاتل

ہمیشہ سے ہلاک اک دوسرے کے
مرا سر اور تری تلوار قاتل

تری آنکھوں کو جاناں کیا ہوا ہے
کبھی دیکھے نہ تھے بیمار قاتل

خوابِ گل پریشان ہے

وہاں کیا دادِ خواہی کیا گواہی
جہاں ہوں منصفوں کے یارِ قاتل

فراز اس دشمنِ جاں سے گلہ کیا
ہمیشہ سے رہے دلدارِ قاتل



فراق و وصل کیا ہیں عاشقی کے تجربے ہیں
مگر اس سے زیادہ زندگی کے تجربے ہیں

وفا کا زیاں بربادی۔ جاں مرگ سماں
ہمارے ہی نہیں شاید سبھی کے تجربے ہیں

کوئی ست گر سرِ کہسار بیٹھا تیشہ زن ہے
یہ ہم کیا ہیں، یہ تم کیا ہو، اسی کے تجربے ہیں

تری ہمیروں سی آنکھیں اور ترے یاقوت سے لب
کسی انساں کے چہرے پر کسی کے تجربے ہیں

خواب گل پریشان ہے

وہی ہیں شعر جاناں جو تری چاہت میں لکھے
کہ باقی جو بھی ہیں سب شاعری کے تجربے ہیں

فراز اس کو کوئی قاتل کہے کوئی میسما
جدا اک دوسرے سے ہر کسی کے تجربے ہیں



نتے سفر میں ابھی ایک نقص باقی ہے
جو شخص ساتھ نہیں اس کا عکس باقی ہے

اٹھا کے لے گئے دزدانِ شب چراغ تلک
سو، کور چشم پتنگوں کا رقص باقی ہے

گستاخ بھی ہے مگر ٹوٹ کر نہیں برسی
ہوا پٹی ہے مگر پھر بھی حس باقی ہے

الٹ پلٹ گئی دنیا وہ زلزلے آئے
مگر خرابہ دل میں وہ شخص باقی ہے

فراز آئے ہو تم اب رفیقِ شب کو لیے
کہ دورِ جام نہ ہنگامِ رقص باقی ہے



تجھ پر بھی نہ ہو گمان میرا
اتنا بھی کہا نہ مان میرا

میں دکھتے ہوتے دلوں کا عینی
اور جسم لہو لبان میرا

کچھ روشنی شہر کو ملی تو
جلتا ہے جلے مکان میرا

یہ ذات یہ کائنات کیا ہے
تو جان مری جہان میرا

تو آیا تو کب پلٹ کے آیا
جب ٹوٹ چکا تھا مان میرا

جو کچھ بھی ہوا یہی بہت ہے
تجھ کو بھی رہا ہے دھیان میرا



اک شب تھا وہ میہمان میرا
کچھ اور ہی تھا جہان میرا

تھے سخن میں خوشبوؤں کے خمیے
تھا رشکِ چمن مکان میرا

وہ شاخِ گلاب اور اس پر
بر پھول تھا ترجمان میرا

وہ چاند تھا میرے بازوؤں میں
آغوش تھا آسمان میرا

یاد آتا ہے اب بھی اس کا کہنا
”میرا شاعر پٹھان میرا“

احمد سے فراز ہو چکا ہوں
پر خوش نہیں خاندان میرا

کالی دیوار

گل واشنگٹن شہر کی ہم نے سیر بہت کی یار
گونج رہی تھی سارے جگ میں جس کی جے جے کار

ملکوں ملکوں ہم گھومے تھے بنجاروں کی مثل
لیکن اس کی سچ سچ سچ دلداروں کی مثل

روشنیوں کے رنگ . ہمیں یوں رستہ نظر نہ آئے
من کی آنکھوں والا بھی یاں اندھا ہو ہو جائے

بالا بام چراناں رستے روپ بھرے بازار
جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے خوابوں کا سنسار

ایک سفید حویلی جس میں بہت بڑی سرکار
یہیں کریں سوداگر چھوٹی قوموں کا بیوپار

یہیں پہ جادوگر بیٹھا جب کہیں کی ڈور ہلاتے
ہر بستی ناگاساکی، ہمیروشیما بن جاتے

اسی حویلی سے کچھ دور ہی اک کالی دیوار
لوگوں کی وہ بھیر لگی تھی چلنا تھا دشوار

اس کالی دیوار پہ کندہ دیکھے سزاروں نام
ان ناموں کے بیچ لکھا تھا ”شہدائے ویتنام“

دور دور سے جمع ہوئے تھے طرح طرح کے لوگ
آنکھوں آنکھوں ویرانی تھی چہروں چہروں سوگ

بیکل بہنیں گھاتل ماتیں کر لاتی بیواتیں
ساجن تم کس دیں سدھارے پوچھیں محبوباتیں

اپنے پیاروں دلداروں کا اوجھل مکھڑا ڈھونڈیں
اس کالی دیوار پہ ان کے نام کا نگرہ ڈھونڈیں

دلوں میں غم پلکوں پر شبہم ہاتھوں میں پھول اٹھائے
اس ناموں کے قبرستان کا ہمید کوئی کیا پائے

نا تربت نا کتبہ کوئی نا ہڈی نا ماس
پھر بھی پاگل نیناں کو تھی پیا ملن کی آس

کہیں کہیں دیوار پہ چپاں ایک سفید گلاب
جیسے ماں کا کوئی آنسو جیسے باپ کا خواب

سہمی کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکے ایک سوال
کس کارن مٹی میں ملائے ہمیروں جیسے لال

پیلے دیں پہ ہم نے کیا کیا اندھیارے برساتے
اس کے جیالے تو کٹ مر کر روشنیاں لے آنے

لیکن اتنے چاند کنوا کر ہم نے بھلا کیا پایا
ہم بہ قسمت ایسے جن کو دھوپ ملی نا چھایا

کھا۔ موتی دے کر حاصل کی یہ کالی دیوار
یہ کالی دیوار جو بس ہے اک خالی دیوار

یہ کالی دیوار جو ہے ناموں کا قبرستان
واشنگٹن کے شہر میں دفن ہیں کس کس کے ارمان

بنگلہ دیش

(ڈھاکہ میوزیم دیکھ کر)

کبھی یہ شہر مرا تھا زمین میری تھی
مرے ہی لوگ تھے میرے ہی دست و بازو تھے
میں جس دیار میں بے یار و بے رفیق پھروں
یہاں کے سارے صنم میرے آشنا رُو تھے

کے خبر تھی کہ عمروں کی عاشقی کا مال
دلِ شکستہ و چشمِ پُر آب جیسا تھا
کے خبر تھی کہ اس دہلہ۔۔ محبت میں
ہمارا ساتھ بھی موج و جاب جیسا تھا

خبر نہیں یہ رقابت تھی نا خداؤں کی
 کہ یہ سیاستِ درباں کی چال تھی کوئی
 دو نیم ٹوٹ کے ایسی ہوئی زمیں جیسے
 مری اکائی بھی خواب و خیال تھی کوئی

یہ میوزیم تو ہے اس روزِ بد کا آئینہ
 جو نفرتوں کی تہوں کا حساب رکھتا ہے
 کہیں لگا ہوا انبارِ استخوان تو کہیں
 لہو میں ڈوبا ہوا آفتاب رکھتا ہے

کہیں مرے سپہ سالار کی جھکی گردن
 عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا سماں
 مرے خدا مری بینائی چھین لے مجھ سے
 میں کیسے دیکھ رہا ہوں ہزیمتِ یاراں

میں سر جھکائے ہوئے درد کو چھپاتے ہوئے
پلٹ کے آیا تو ہر رگبزر اندھیری تھی
میں سوچتا ہوں ابھی تو چراغ روشن تھے
کبھی یہ شہر مرا تھا زمین مسیری تھی



کسی جانب سے بھی پرچم نہ لہو کا نکلا
اب کے موسم میں بھی عالم وہی ہو کا نکلا

دستِ قاتل سے کچھ امیدِ شفا تھی، لیکن
نوکِ خنجر سے بھی کانٹا نہ گلو کا نکلا

عشق الزام لگاتا تھا ہوس پر کیا کیا
یہ مناق بھی ترے وصل کا بھوکا نکلا

جی نہیں چاہتا میخانے کو جائیں، جب سے
شیخ بھی بزم نشیں اہل سبو کا نکلا

خواب گل پریشان ہے

دل کو ہم چھوڑ کے دنیا کی طرف آتے تھے
یہ نسبتاں بھی اسی غالیہ مو کا نکلا

ہم عبث سوزن و رشتہ لیے گلیوں میں پھرے
کسی دل میں نہ کوئی کام رفو کا نکلا

یارِ بے فیض سے کیوں ہم کو توقع تھی فرار
جو نہ اپنا نہ ہمارا نہ عدو کا نکلا



غمِ رگ و پے میں نہیں جب سے شرارے کی مثال
شاعری روٹھ گئی ہے کسی پیارے کی مثال

جانے کب آئے نظر مصرعہ تر کی صورت
جانے کب سانس چلے سینے میں آئے کی مثال

جانے کب ہاتھ لگے یاد کا موتی کوئی
جانے کب لفظ بچے نام تمہارے کی مثال

بے سبب کیسے طبیعت ہو سخن پر مائل
کوئی ترغیب، تو ہو تیرے اشارے کی مثال

غم دنیا تو وہ قلم ہے کہ دل کا مضمون
غرق ہوتا چلا جاتا ہے کنارے کی مثال

ہم بھی کیا ہیں کہ وہاں دل کی دوا پوچھتے ہیں
چارہ گر بھی ہو جہاں درد کے مارے کی مثال

ہم کہاں جانتیں جہاں تجھ سے ستمگر نہ ملیں
اب تو ہر شہر ہوا شہر تمہارے کی مثال



ہونٹ ہیروں سے نہ چہرہ ہے ستارے کی مثال
پھر بھی لاوے تو کوئی دوست ہمارے کی مثال

مجھ سے کیا ڈوبنے والوں کا پتہ پوچھتے ہو
میں سمندر کا حوالہ نہ کنارے کی مثال

زندگی اوڑھ کے بیٹھی تھی روائے شبِ غم
تیرا غم تاک دیا ہم نے ستارے کی مثال

عاشقی کو بھی ہوس پیشہ تجارت جانیں
وصل ہے نفع تو ہجران ہے خسارے کی مثال

خواب گل پریشان ہے

ہم کبھی ٹوٹ کے روتے نہ کبھی کھل کے بنے
رات شبہم کی طرح صبح ستارے کی مثال

ناسپاسی کی بھی حد ہے جو یہ کہتے ہو فراز
زندگی ہم نے گزاری ہے گزارے کی مثال



دوستو یوں بھی نہ رکھو خُم و پیمانہ کھلے
چند ہی روز ہوتے ہیں ابھی میخانہ کھلے

اک ذرا رنگ پہ آئے تو سہی جوشِ بہار
اک ذرا ڈانگ کا موسم ہو تو دیوانہ کھلے

روئے دلبر کی طرح ابر سے جھلکے مہتاب
کا کلِ شب کی طرح گیوتے جانانہ کھلے

حسن کے ہجران میں کتابوں پہ کتابیں لکھ دیں
اس پہ گر حال ہمارا نہیں کھلتا نہ کھلے

مہرباں ایسی ہے تنہائی کہ پل بھر کے لیے
چشم بستہ ہو تو یادوں کا پریشانہ کھلے

ہم تو سچ مچ کے ہی کردار سمجھ بیٹھے تھے
لوگ آخر کو کہیں صورتِ افسانہ کھلے

جانے یہ پیار سکھاتے ہیں کہ انکار فراز
ہم پہ بت خانہ و کعبہ و کلیسا نہ کھلے

من و تو

قصیدہ

معاف کر مری مستی خدائے عز و جل
کہ میرے ہاتھ میں ساغر ہے میرے لب پہ غزل

کریم ہے تو مری لعزشوں کو پیار سے دیکھ
رحیم ہے تو سزا و جزا کی حد سے نکل

ہے دوستی تو مجھے اذنِ مسزبانی دے
تُو آسماں سے اتر اور مری زمین پہ چل

میں پا بہ گل ہوں مگر چھو چکا منارہ۔ عرش
سو تُو بھی دیکھ یہ خاک و خشارہ و جنگل

بہت عزیز ہے مجھ کو یہ خاکداں میرا
یہ کوسار یہ قلزم یہ دشت یہ دلدل

مرے جہاں میں زمان و مکان و لیل و نہار
ترے جہاں میں ازل ہے ابد نہ آج نہ کل

مرے لبو میں ہے برقی تپاں کا جذب و گریز
ترے سبو میں مئے زندگی نہ زمرِ اہل

تری بہشت ہے دشتِ محمود و بحرِ سکوت
مری سرشت ہے آشوبِ ذات سے بیکل

تُو اپنے عرش پہ شاداں ہے سو خوشی تیری
میں اپنے فرش پہ نازاں ہوں اے نگارِ ازل

مجھے نہ جنتِ گم گشتہ کی بشارت دے
کہ مجھ کو یاد ابھی تک ہے ہجرتِ اول

ترے کرم سے یہاں بھی مجھے پھیر ہے
جو زاہدوں کی عبادت میں ڈالتا ہے خل

وہ سیرِ چشمن ہوں، میرے لئے ہے بے وقعت
جمالِ حور و شرابِ طہور و شیر و عسل

گناہگار تو ہوں پر نہ اسقدر کہ مجھے
صلیب روزِ مکافات کی لگے بوجھل

کہیں کہیں کوئی لالہ کہیں کہیں کوئی داغ
مری بیاض کی صورت ہے میری فردِ عمل

وہ تُو کہ عقدہ کشا و مسبب الاسباب
یہ میں کہ آپ معمر ہوں آپ اپنا ہی حل

میں آپ اپنا ہی ہابیل اپنا ہی قابیل
مری ہی ذات ہے مقتول و قاتل و مقتل

خواب گل پریشان ہے

برس برس کی طرح تھا نفس نفس میرا
صدی صدی کی طرح کاٹتا رہا پل پل

ترا وجود ہے لاریب اشرف و اعلیٰ
جو سچ کہوں تو نہیں میں بھی ارزل و اسفل

یہ واقعہ ہے کہ شاعر وہ دیکھ سکتا ہے
رہے جو تیرے فرشتوں کی آنکھ سے او جھل

وہ پرفشاں ہیں مگر غولِ شپرک کی طرح
سو رائیگاں ہیں کہ جوں چشمِ کور میں کاہل

مرے لیے تو ہے سو بخششوں کی اک بخشش
قلم جو افسر و طبل و علم سے ہے افضل

یہی قلم ہے کہ جس کی ستارہ سازی سے
دلوں میں جوت جگاتی ہے عشق کی مشعل

یہی قلم ہے جو دکھ کی روتوں میں بجٹا ہے
دلوں کو پیار کا مرہم سکون کا صندل

یہی قلم ہے کہ اعجازِ حرف سے جس کے
تمام عشوہ طرازانِ شہر ہیں پاگل

یہی قلم ہے کہ جس نے مجھے یہ درس دیا
کہ سنگ و خشت کی زد پر رہیں گے شیش محل

یہی قلم ہے کہ جس کی صریر کے آگے
ہیں سرمہ درنگو خونخوار لشکروں کے بگل

یہی قلم ہے کہ جس کے ہنر سے نکلے ہیں
رہِ حیات کے خم ہوں کہ زلفِ یار کے بل

یہی قلم ہے کہ جس کی عطا سے مجھ کو ملے
یہ چاہتوں کے شگوفے محبتوں کے کنول

تمام سینہ نگاروں کو یاد میرے سخن
ہر ایک غمیرتِ مریم کے لب پہ میری غزل

اسی نے سہل کتے مجھ پہ زندگی کے عذاب
وہ عہدِ سنگ زنی تھا کہ دورِ تیغِ اہل

اسی نے مجھ کو سبھائی ہے راہِ اہل صفا
اسی نے مجھ سے کہا ہے پلِ صراط پہ چل

اسی نے مجھ کو چٹانوں کے حوصلے بختے
وہ کربلائے فنا تھی کہ کارِ گاہِ جدل

اسی نے مجھ سے کہا اسمِ اہلِ صدق امر
اسی نے مجھ سے کہا سچ کا فیصلہ ہے اٹل

اسی کے فیض سے آتشکدے ہوتے گلزار
اسی کے لطف سے ہر زشت بن گیا اجمل

اسی نے مجھ سے کہا جو ملا بہت کچھ ہے
اسی نے مجھ سے کہا جو نہیں ہے ہاتھ نہ مل

اسی نے مجھ کو قناعت کا بوریا بختا
اسی کے ہاتھ سے دستِ درازِ طمع ہے شل

اسی کی آگ سے میرا وجود روشن ہے
اسی کی آب سے میرا ضمیر ہے صیقل

اسی نے مجھ سے کہا بیعت یزید نہ کر
اسی نے مجھ سے کہا مسلکِ حسین پہ چل

اسی نے مجھ سے کہا زہر کا پیالہ اٹھا
اسی نے مجھ سے کہا، جو کہا ہے اس سے نہ ٹل

اسی نے مجھ سے کہا عاجزی سے مات نہ کھا
اسی نے مجھ سے کہا مصلحت کی چال نہ چل

اسی نے مجھ سے کہا غمیرت سخن کو نہ بیچ
کہ خونِ دل کے شرف کو نہ اشرفی سے بدل

اسی نے مجھ کو عنایت کیا یدِ بیضا
اسی نے مجھ سے کہا سحرِ سامری سے نکل

اسی نے مجھ سے کہا عقل تہہ نشینی ہے
اسی نے مجھ سے کہا ورطہ۔ خرد سے نکل

اسی نے مجھ سے کہا وضعِ عاشقی کو نہ چھوڑ
وہ خواہ عجز کا لمحہ ہو یا غرور کا پل

اذیتوں میں بھی بخشش مجھے وہ نعمتِ صبر
کہ میرے دل میں گرہ ہے نہ میرے ماتھے پہ بل

ہیں ثبت سینہ۔ مہتاب پر قدم میرے
ہیں منظر میرے مرغ و مشتری و زحل

تری عطا کے سبب یا مری انا کے سبب
کسی دعا کا ہے موقع نہ التجا کا محل

سو تجھ سا ہے کوئی خالق نہ مجھ سی ہے مخلوق
نہ کوئی تیرا ہے ثانی نہ کوئی میرا بدل

فراز تو بھی جنوں میں کدھر گیا ہے نکل
ترا دیار محبت، تری نگار غزل

ق

ٹپک چکا ہے بہت تیری آنکھ سے خونباب
برس چکا ہے بہت تیرے درد کا بادل

کچھ اور دیر ابھی حسرتِ وصال میں رہ
کچھ اور دیر ابھی آتشِ فراق میں جل

کسی بہارِ شمائل کی بات کر کہ بنے
ہر ایک حرفِ شگوفہ ہر ایک لفظ کنول



تجھ سے مل کر تو یہ لگتا ہے کہ اے اجنبی دوست
تو مری پہلی محبت تھی مری آخری دوست

لوگ ہر بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں
یہ تو دنیا ہے مری جاں کئی دشمن کئی دوست

تیرے قامت سے بھی لپٹی ہے امر بیل کوئی
میری چاہت کو بھی دنیا کی نظر کھا گئی دوست

یاد آتی ہے تو پھر ٹوٹ کے یاد آتی ہے
کوئی گزری ہوئی منزل کوئی بھولی ہوئی دوست

اب بھی آتے ہو تو احسان تمہارا لیکن
وہ قیامت جو گزرنی تھی گزر بھی گئی دوست

تیرے لہجے کی تھکن میں ترا دل شامل ہے
ایسا لگتا ہے جدائی کی گھڑی آ گئی دوست

بارشِ سنگ کا موسم ہے مرے شہر میں تو
تُو یہ ٹہنٹھے سا بدن لے کے کہاں آ گئی دوست

میں اسے عہد شکن کیسے سمجھ لوں جس نے
آخری خط میں یہ لکھا تھا فقط ”آپ کی دوست“



تمام بزم تھی مشتاقِ حرفِ بابتِ دوست
سو میں نے اور بڑھا دی ذرا حکایتِ دوست

وفا تو اپنے سے ہوتی ہے دوسرے سے نہیں
سو اس بنا پہ کوئی کیا کرے شکایتِ دوست

یہ لوگ سرو و صنوبر کا ذکر کرتے ہیں
استعارے نہیں حسبِ قد و قامتِ دوست

وہ بے نیاز بھی ہو گا مگر یہ بات سمجھ
ہر ایک عرض نہیں درخورِ سماعتِ دوست

ادھر ادھر نہ یونہی زندگی لٹاتے پھرو
کہ صرف دل ہی نہیں جاں بھی ہے امانتِ دوست

تمام وار کسی ایک مہرباں کے نہیں
کوئی ہے بخششِ دنیا کوئی عنایتِ دوست

تمہی بتاؤ کہ طے کس طرح کرو گے فراز
یہ عمر بھر کا سفر اور بے رفاقتِ دوست



فقط ہنر ہی نہیں عیب بھی کمال کے رکھ
سو دوسروں کے لیے تجربے مثال کے رکھ

نہیں ہے تاب تو پھر عاشقی کی راہ نہ چل
یہ کارِ زارِ جنوں ہے بنگر نکال کے رکھ

سبھی کے ہاتھ دلوں پر نگاہ تجھ پر ہے
قدحِ بدست ہے ساقی قدم سنبھال کے رکھ

فریب سے نہ مجھے صید کر وقار سے کر
سو اسقدر بھی نہ دانہ قریب جال کے رکھ

فراز بھول بھی جا سانخے محبت کے
ہتھیلیوں پہ نہ ان آبلوں کو پال کے رکھ



شبِ نشاط تھی یا صبحِ پُر ملاں تھی وہ
تھکن سے چور تھا میں نیند سے بڈھال تھی وہ

میں اس کی ہمسفری میں بھی دل گرفتہ رہا
کہ ہر قدم پہ جدائی کا احتمال تھی وہ

ادھر ادھر کے بھی کردار آتے جاتے رہے
مرے سخن کا مگر مرکزی خیال تھی وہ

وہ پیرہن تھی مگر جسم و جاں رہی میری
کہ جو بھی جیسا بھی موسم تھا حسبِ حال تھی وہ

خواب گل پریشان ہے

تمام عمر اگر زندگی نے زخم دیتے
تمام عمر کے زخموں کا اندماں تھی وہ

یہ عمر بھر کا اثاثہ اسی کے نام تو ہے
اگرچہ میری رفاقت میں چند سال تھی وہ

فراز یاد ہے اب تک سپردگی اس کی
ز فرق تا بقدم خواہشِ وصال تھی وہ



تُو جو چاہے تو نہیں ہوں تُو جو چاہے تو میں ہوں
میری اوقات ہی کیا ہے پر کا ہے تو میں ہوں

تیرے غم نے مری ہستی کی ضمانت دی تھی
تیرا غم اپنے تعلق کو بنا ہے تو میں ہوں

دل نے کب شہیوہ۔۔ در یوزہ گری ترک کیا
تیرے در پر نہ ہوا میں سہرا ہے تو میں ہوں

جانے کیا رنگ دکھاتی ہے بہاراں اب کے
دل دریدہ و پریشان نگاہے تو میں ہوں

خواب گل پریشان ہے

تو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں تیری
یار! اکثر نہ سہی گاہے بگاہے تو میں ہوں

حیف اس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر جاتے
وقت اگر کل بھی سخن میرے سراسے تو میں ہوں

اور کیا چاہیے اس فقر و فقیری میں فراز
صاحبِ خرقہ وہ پیوند کلاہے تو میں ہوں

خوابوں کے بیوپاری

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
ہم راکھ لیے ہیں جھولی میں
اور سر پہ ہے ساہوکار کھڑا

یاں بوند نہیں ہے ڈیوے میں
وہ باج بیاج کی بات کرے
ہم بانجھ زمین کو تکتے ہیں
وہ ڈھور اناج کی بات کرے
ہم کچھ دن کی مہلت مانگیں
وہ آج ہی آج کی بات کرے

جب دھرتی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روتے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سُر سنگیت میں سوتے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے

کچھ خواب سہل مسکانوں کے
کچھ بول کبت دیوانوں کے
کچھ لفظ جنہیں معنی نہ ملے
کچھ گیت شکستہ جانوں کے
کچھ نیر وفا کی شمعوں کے
کچھ پر پاگل پروانوں کے

پھر اپنی گھاتل آنکھوں سے
خوش ہو کے لہو چھڑکایا تھا
مائی میں ماس کی کھاد بھری
اور نس نس کو زخمایا تھا
اور بھول گئے تہنحلی رت میں
کیا کھویا تھا کیا پایا تھا

ہر بار گلن نے وہم دیا
اب کے برکھا جب آئے گی
ہر بیج سے کونیل پھوٹے گی
اور ہر کونیل پھل لائے گی
سر پر چھایا چھتری ہو گی
اور دھوپ گھٹا بن جائے گی

جب فصل کٹی تو کیا دیکھا
کچھ درد کے ٹوٹے گجرے تھے
کچھ زخمی خواب تھے کانٹوں پر
کچھ خاکستر سے کجرے تھے
اور دور افق کے ساگر میں
کچھ ڈولتے ڈوبتے بجرے تھے

اب پاؤں کھڑاؤں دھول بھری
اور جسم پہ جوگ کا چولا ہے
سب سنگی ساتھی بھید بھرے
کوئی مارہ ہے کوئی تولا ہے
اس تاک میں یہ اس گھات میں وہ
ہر اور جھگوں کا ٹولا ہے

اب گھاٹ نہ گھر دہلیز نہ در
اب پاس رہا ہے کیا بابا
بس تن کی گٹھڑی باقی ہے
جا یہ بھی ٹو لے جا بابا
ہم بستی چھوڑے جاتے ہیں
تو اپنا قرض چکا بابا



دکھ فسانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
دل بھی مانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

آج تک اپنی بے کلی کا سبب
خود بھی جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

بے طرح حالِ دل ہے اور تجھ سے
دوستانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

ایک تو حرف آشنا تھا مگر
اب زمانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

قاصدا ! ہم فقیر لوگوں کا
اک ٹھکانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

اے خدا دردِ دل ہے بخششِ دوست
آب و دانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

اب تو اپنا بھی اس گلی میں فراز
آنا جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں



اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں

تو بھی ہمیرے سے بن گیا پتھر
ہم بھی کل جانے کیا سے کیا ہو جائیں

تو کہ یکتا تھا بے شمار ہوا
ہم بھی ٹوٹیں تو جا جا ہو جائیں

ہم بھی مجبوریوں کا عذر کریں
پھر کہیں اور بستلا ہو جائیں

ہم اگر منزلیں نہ بن پائے
منزلوں تک کا راستا ہو جائیں

دیر سے سوچ میں ہیں پروانے
راکھ ہو جائیں یا ہوا ہو جائیں

عشق بھی کھیل ہے نصیبوں کا
خاک ہو جائیں، کیمیا ہو جائیں

اب کے گر ٹوٹے تو ہم تجھ سے
ایسے لپٹیں تری قبا ہو جائیں

بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فراز
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں

وہ تری طرح کوئی تھی

یونہی دوش پر سنبھالے

گھسنی زلف کے دو شالے

وہی سانولی سی رنگت

وہی نین نیند والے

وہی من پسند قامت

وہی خوشنما سراپا

جو بدن میں نیم خوابی

تو لہو میں رچکا سا

کسبھی پیاس کا سمندر
کسبھی آس کا جزیرہ
وہی مہربان لہجہ
وہی مسیزباں و طیرہ

تجھے شاعری سے رغبت
اے شعر یاد میرے
وہی اس کے بھی قرینے
جو ہیں خاص وصف تیرے

کسی اور ہی سفر میں
سہرا راہ مل گئی تھی
تجھے اور کیا بتاؤں
وہ تری طرح کوئی تھی

خوابِ مہل پریشان ہے

کسی شہرِ بے اماں میں
میں وطن بدر اکیلا
کبھی موت کا سفر تھا
کبھی زندگی سے کھیلا

مرا جسم جل رہا تھا
وہ گھٹا کا ساتباں تھی
میں رفاقتوں کا مارا
وہ مری مزاج داں تھی

مجھے دل سے اس نے پوجا
اسے جاں سے میں نے چلایا
اسی ہم رہی میں آخر
کہیں آگیا دوراں

یہاں گم رہی کے امکاں
اسے رنگ و بو کا پکا
یہاں لعزثوں کے سماں
اسے خواہشوں نے تھپکا

یہاں دام تھے مزاروں
یہاں ہر طرف قفس تھے
کہیں زر زمیں کا دلدل
کہیں جال تھے ہوس کے

وہ فنا کی فاختہ تھی
وہ ہوا کی راج پتری
کسی گھاٹ کو نہ دیکھا
کسی جمیل پر نہ اتری

خواب گل پریشان ہے

پھر اک ایسی شام آتی
کہ وہ شام آخری تھی
کوئی زلزلہ سا آیا
کوئی برق سی گری تھی

عجب آندھیاں چلیں پھر
کہ بکھر گئے دل و جاں
نہ کہیں گلِ وفا تھا
نہ چراغِ عہد و پیمان

وہ جہاز اتر گیا تھا
یہ جہاز اتر رہا ہے
تری آنکھ میں ہیں آنسو
مرا دل بکھر رہا ہے

تُو جہاں مجھے ملی ہے
وہ یہیں جرا ہوتی تھی
تجھے اور کیا بتاؤں
وہ تری طرح کوئی تھی



چمن میں نغمہ سمراتی کے بعد یاد آئے
قفس کے دوست رہائی کے بعد یاد آئے

وہ جن کو ہم تیری قربت میں بھول بیٹھے تھے
وہ لوگ تیری جدائی کے بعد یاد آئے

وہ شعر یوسف کنگاں تھے جن کو بیچ دیا
ہمیں قلم کی کمائی کے بعد یاد آئے

حریم ناز کے خیرات بانٹنے والے
ہر ایک در کی گدائی کے بعد یاد آئے

ہم اتنے بھی گتے گزرے نہیں تھے جانِ فراز
کہ تجھ کو ساری خدائی کے بعد یاد آئے

یہ دکھ آساں نہ تھے جاناں

برس یا دو برس کی قید تنہائی بھی گر ہوتی
تو پھر بھی زندگی لاچار ہو جاتی

محبت بے وفا اور دوستی سبزار ہو جاتی
مگر تم نے تو سارے ہجر کے بیمار موسم
بیٹیلی بیچارگی اور کرب کے

بوسیدہ بستر پر گزارے ہیں

سیرِ بالیں

کسی کے ہاتھ میں چارہ گرمی کی شمع لہریں
اور نہ آوازوں کے روشن داں

نشاطِ خواب کیا

جب وارہے دروازہ مژگاں

یہ دکھ آساں نہ تھے جاناں
پرانی داستانوں میں تو ہوتا تھا
کہ کوئی شہزادی یا کوئی نیلم پری
دیووں یا آسیبوں کی قیدی
اپنے آدم زاد دیوانے کی رہتے
شببہ سنگ ہو جاتی
مگر وہ داستانیں تھیں
پھران میں بھی تو آخر کار
اس کا باو فاساونت شہزادہ
سمندر پار کرتا
وار کرتا

کوہساروں کے جسد مسمار کرتا
ان ظلمساقی حصاروں سے اسے آزاد کر کے
ساتھ لے جاتا

مگر تو داستانوں کا کوئی کردار
یا پارینہ قصوں کا کوئی حصہ نہ تھی

تو نے تو خود آزارگی اپنے تئیں ہی منتخب کی تھی
کئی دن پھر کئی دن پھر نئے دن
پھر کئی راتیں گئی راتیں نئی راتیں
بدن کا دوزخی سیال ایندھن
اور لہو کا آتشیں لاوا

رگوں میں دوڑنے پھرنے کا پھر قاتل نہیں رہتا
تعلق کی چٹانیں ریت بن جاتی ہیں
دل داری کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں
ارماں آنسوؤں کا رزق بن جاتے ہیں
اور دل ایک ہی صورت پہ پھر مائل نہیں رہتا
وفاداری بشرط استواری کا چلن
پھر عاشقی کی راہ میں حائل نہیں رہتا
بدل جاتے ہیں خال و خد
پگھل جاتے ہیں جسم و جاں
یہ دکھ آساں نہیں جاناں



بہ اندازِ مثنوی۔ قدیم

تم کہ سنتے رہے اوروں کی زبانی لوگو
ہم سناتے ہیں تمہیں اپنی کہانی لوگو

کون تھا دشمن جاں وہ کوئی اپنا تھا کہ غیر
ہاں وہی دشمن جاں دلبرِ جانی لوگو

زلف زنجیر تھی ظالم کی تو شمشیر بدن
روپ سا روپ جوانی سی جوانی لوگو

سامنے اس کے دکھے زر گسِ شہلا بیمار
روبرو اس کے بھرے سرو بھی پانی لوگو

اس کی گفتار میں خندہ تھا شگفتِ گل کا
اس کی رفتار میں چشمے کی روانی لوگو

اس کے ملبوس سے شرمندہ قبائے لالہ
اس کی خوشبو سے جلے رات کی رانی لوگو

ہم جو پاگل تھے تو بے وجہ نہیں تھے پاگل
ایک دنیا تھی مگر اس کی دوانی لوگو

عشق اور مُشک چھپاتے نہیں چھپتے یوں بھی
کب رہا راز کوئی رازِ نہانی لوگو

ایک تو عشق کیا عشق بھی پھر میرا عشق
اس پہ غالب کی سی آشفتمہ بیانی لوگو

حیلہ جو ویسے بھی ہوتے ہیں زمانے والے
اس پہ آتی نہ ہمیں بات چھپانی لوگو

داستاں کوئی بھی ہو ذکر کسی شخص کا ہو
ہم نے اس نام سے تمہید اٹھانی لوگو

ہاں وہی نام کہ جس نام سے وابستہ ہے
ہر محبت وہ نتی ہو کہ پرانی لوگو

ہم ہی سادہ تھے کیا اس پہ بھروسا کیا کیا
ہم ہی ناداں تھے کہ لوگوں کی نہ مانی لوگو

ہم تو اس کے لیے گھر بار بھی تاج بیٹھے تھے
اس ستمگر نے مگر قدر نہ جانی لوگو

کس طرح بھول گیا قول و قسم وہ اپنے
کتنی بے صرفہ گئی یاد دہانی لوگو

جس طرح تتلیاں باغوں سے سفر کر جاتیں
جیسے الفاظ میں مر جاتیں معانی لوگو

اب غزل کوئی اترتی ہے تو نوے کی طرح
شاعری ہو گئی اب مرثیہ خوانی لوگو

شمع رویوں کی محبت میں یہی ہوتا ہے
رہ گیا داغ فقط دل کی نشانی لوگو



عشقِ نشہ ہے نہ جادو جو اتر بھی جائے
یہ تو اک سیلِ بلا ہے سو گزر بھی جائے

تمنّی۔ کام و دہن کب سے عذابِ جاں ہے
اب تو یہ زہرِ رگ و پے میں اتر بھی جائے

اب کے جس دشتِ تمنا میں قدم رکھا ہے
دل تو کیا چیز ہے امکاں ہے کہ سر بھی جائے

ہم بگولوں کی طرح خاک بسر پھرتے ہیں
پاؤں مثل ہوں تو یہ آشوبِ سفر بھی جائے

لٹ چکے عشق میں اک بار تو پھر عشق کرو
کس کو معلوم کہ تقدیر سنور بھی جائے

شہرِ جاناں سے پرے بھی کتنی دنیا تیں ہیں
ہے کوئی ایسا مسافر جو ادھر بھی جائے

اس قدر قرب کے بعد ایسے جدا ہو جانا
کوئی کم حوصلہ انساں ہو تو مر بھی جائے

ایک مدت سے مقدر ہے غریب الوطنی
کوئی پردیس میں ناخوش ہو تو گھر بھی جائے



تُو کس طرح سے یہ احساں مگر اُتارے گا
عطا کرے گا جو دستار، سر اُتارے گا

نہ مانگ ایک بھی لمحہ خوشی کا دنیا سے
یہ قرض وہ ہے جسے عمر بھر اُتارے گا

یہ عمر بھر کی تھکن ایک دن تو اترے گی
کوئی تو دوش سے بارِ سفر اُتارے گا

یہ لگ رہا ہے ستاروں کی چال سے کہ فلک
کوئی عذاب مری خاک پر اُتارے گا

چمن کو زہر سے سہینچا ہے باغبان نے فرراز
اہل گرفتہ ہی کوئی ثمر اُتارے گا



میں دھوکا ہوں تو دھوکا ہے
ترک و طلب ہر دو دھوکا ہے

تیری ہر مسکان فریبی
میرا ہر آنسو دھوکا ہے

سارے گل بوٹے مصنوعی
رنگ ، نمو ، خوشبو دھوکا ہے

کون ہے یکتا کون یگانہ
مدحِ رخ و گیسو دھوکا ہے

لافِ محبت ہرزہ سرائی
دلبرِ عالیہ مو دھوکا ہے

چاکِ جگر اک شعبدہ بازی
اُس پر کارِ رفو دھوکا ہے

مکر ہے عشق کا دیوانہ پن
حسن کا سب جادو دھوکا ہے

نالہ۔ قمری وہمِ سماعت
سرو کنارِ جو دھوکا ہے

رنگِ پے طاؤسِ نائش
سحرِ رمِ آہو دھوکا ہے

عکس فقط نیرنگِ نظر کا
ہر بُتِ آتہ رُو دھوکا ہے

نشہ کہاں ہے زخم کا مرہم
ساقی و جام و سبو دھوکا ہے

کاوشِ لوح و قلمِ افسانہ
قصہ تیغ و گلو دھوکا ہے

کس نے خون کے آنوروتے
دامن لہو لہو دھوکا ہے

مستوں کی مستی دکھلاوا
صوفی کی یا ہُو دھوکا ہے

خواب گل پریشان ہے

مسجد میں بٹ مار ہے ملا
مندر میں بھکٹو دھوکا ہے

کذب و ریا کی ڈفلی باجے
چیلہ جھوٹ، گرو دھوکا ہے

جو پاگل تھے سو پاگل ہیں
حکمت کا داڑو دھوکا ہے

اُتر دکھن پورب پچھم
اس جگ میں ہرٹو دھوکا ہے



غینم سے بھی عداوت میں حد نہیں مانگی
کہ ہار مان لی لیکن مدد نہیں مانگی

مزار شکر کہ ہم اہل حرفِ زندہ نے
مجاورانِ ادب سے سند نہیں مانگی

بہت ہے لمحہ۔ موجود کا شرف بھی مجھے
سو اپنے فن سے بقائے ابد نہیں مانگی

قبول وہ جسے کرتا ہے التجا نہیں کی
دعا جو وہ نہ کرے مسترد، نہیں مانگی

خوابِ گل پریشان ہے

میں اپنے جامہ۔ صد چاک سے بہت خوش ہوں
جسکھی عبا و قبائے خرد نہیں مانگی

”شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں“
جسکھی تو گور کنوں سے لحد نہیں مانگی

میں سر برہنہ رہا پھر بھی سر کشیدہ رہا
جسکھی کلاہ سے توقیرِ قد نہیں مانگی

عطائے درد میں وہ بھی نہیں تھا دل کا غریب
فراز میں نے بھی بخشش میں حد نہیں مانگی



خود سے روٹھوں تو کتنی روز نہ خود سے بولوں
پھر کسی درد کی دیوار سے لگ کر رولوں

تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

میں کہ اک صبر کا صحرا نظر آتا ہوں تجھے
تُو جو چاہے تو ترے واسطے دریا رولوں

اور معیار رفاقت کے ہیں ایسا بھی نہیں
جو محبت سے ملے ساتھ اسی کے ہولوں

خود کو عمروں سے مقفل کئے بیٹھا ہوں فراز
وہ کبھی آئے تو خلوت کدہ۔ جاں کھولوں

تجھے کیا خبر کہ جاناں

تُو نہ تھی کوئی سمرائے
کہ میں رات بھر ٹھہر کے
سفر اختیار کرتا
میں نہ تھا کوئی مسافر
کہ جو گھر نگر کوچ کر
کہیں اور پیار کرتا

انہی بستیوں میں ورنہ
کتی دل کتی نگاہیں
کوئی نیند کا ہو رسیا
تو ہزار خوابگاہیں

کہیں کالوں کے بادل
کہیں قامتوں کی چھاؤں
کہیں شہرِ آرزو کے
کہیں حسرتوں کے گاؤں

کہیں خلوتیں دکانیں
کہیں جسم بیوپاری
نہ کسی صنم کو شکوہ
نہ دکھی کوئی پجاری

یہ عجب قمار خانے
یہاں ہر بھی کمانی
نہ کسی کا مان ٹوٹا
نہ کسی نے چوٹ کھائی

کوئی بے مال قصہ
کوئی داستاں ادھوری
یہ سپردگی جدائی
تو وہ احتلاط دوری

یہاں شوق بھی تماشا
یہاں عشق بھی ملامت
نہ تو وصل خوبصورت
نہ فراق ہی قیامت

یہ ضرورتوں کے میلے
یہ قیام کے بہانے
یہ تھکن اتارنے کے
یہ سبھی عارضی ٹھکانے

یہ ہمارے عہد و پیمان
تجھے کیا خبر کہ جاناں
یہ دنوں کی بات کب تھی
یہ رفاقتوں کی صدیاں

یہ جو درد ہے امر ہے
کہ وفا ہے حرفِ آخر
تو نہ تھی کوئی سرائے
نہ میں ہوں کوئی مسافر



روزِ روشن بھی ترا لوحِ مسیہ بھی تیری
پھر تو یارب مری رو ددِ گنہ بھی تیری

ابرو باراں پہ نہ کر ناز کہ اے دستِ کریم
کشتِ بے دانہ و بے آب و گیہ بھی تیری

امتحانِ دل کا نہیں طبل و علم کا ہے تو پھر
جا یہ لشکر بھی ترا تیغ و زرہ بھی تیری

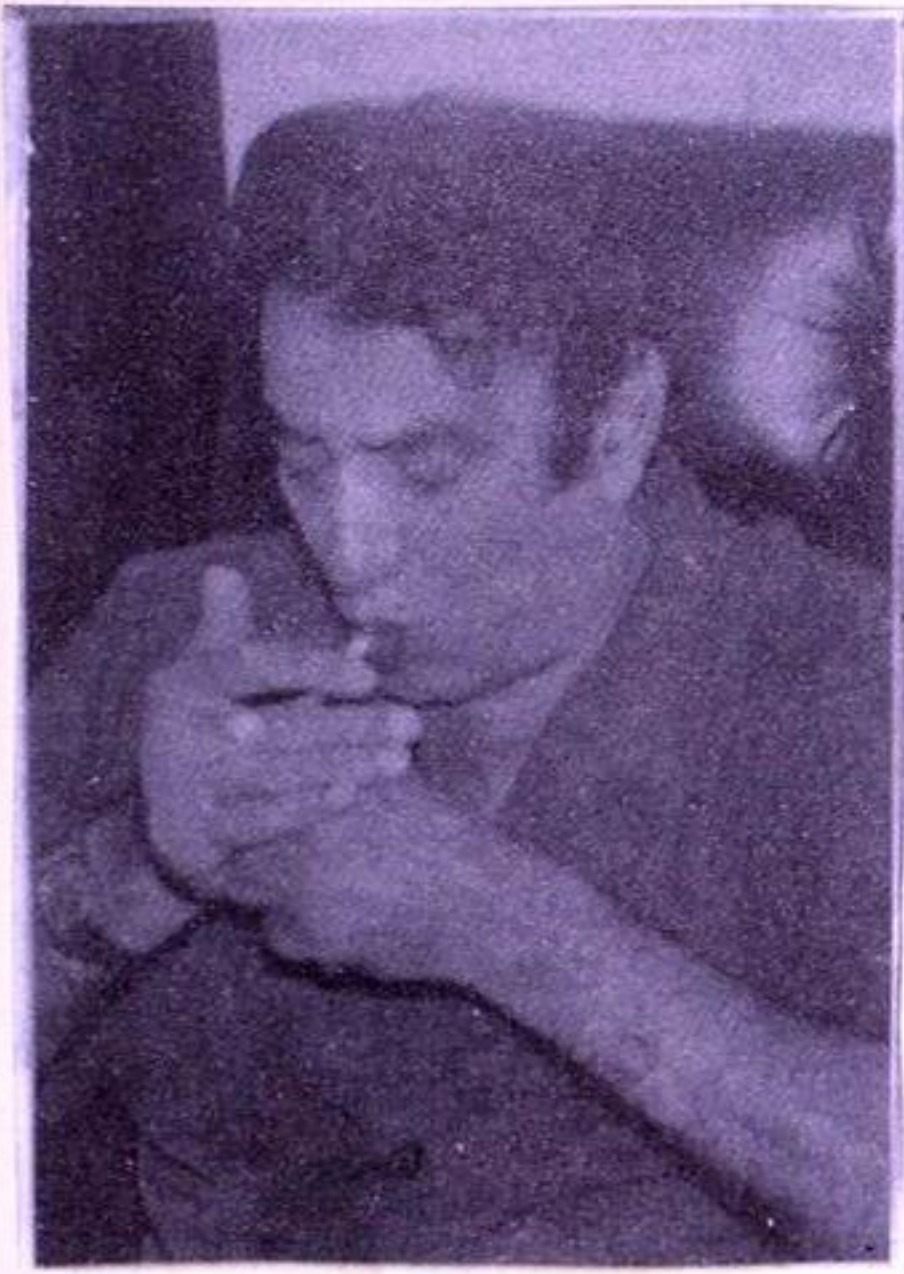
وہ ہمسی ہیں کہ تجھے تیروکماں جھٹتے تھے
اور اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں پنہ بھی تیری

واعظا منبر و مسند پہ نہ اترا اتنا
یہ بتا کیا کسی دل میں ہے جگہ بھی تیری

کیا کریں حرصِ محبت میں بھی در آتی ہے
ورنہ کافی تھی کبھی ایک نگہ بھی تیری

کیا اسی بھول کو کہتے ہیں محبت کا زوال
اب مجھے یاد نہیں سالگرہ بھی تیری

یونہی دو دن کی ملاقات پہ اترا نہ فراز
ہے کہیں یار کی محفل میں جگہ بھی تیری



فراز اپنے وطن کے مظلوموں کے ساتھی ہیں، انہی کی طرح تڑپتے ہیں مگر روتے نہیں بلکہ ان زنجیروں کو توڑتے، ٹکڑے بکھیرتے نظر آتے ہیں جو ان کے معاشرے کے جسم کو جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کا شعر نہ صرف یہ کہ اعلیٰ ادبی معیار کا ہے بلکہ ایک شعلہ ہے جو دل سے زبان تک لپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ آئے فیض اور ن۔ م راشد کے بعد مگر اساتذہ سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک اچھا شاعر اپنے بعد آنے والوں کو راہ دکھاتا اور متاثر کرتا ہے۔ فراز کا شمار اب ان میں ہے۔